بینش صدیقہ
شعبۂ اردو، جامعہ کراچی
ڈاکٹر عظمیٰ حسن
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

اردو کے ادیب، شاعر اور صحافی سفرنامہ نگار

(خصوصی مطالعہ: ابنِ انشا، مستنصر حسین تارڑ، رضا علی عابدی، محمود شام)

ABSTRACT

Authors, Poets and Travelogue Journalists of Urdu
By Beenish Siddiqua, Department of Urdu, University of Karachi./Dr. Uzma Hasan, Assistant Professor, Department of Urdu, University of Karachi.

In any language, travelogue is the genre that meets with highest popularity and acceptance. Everyone who gets catalogued in the holy band of writers does his job with his style and mood, rhythm and tempo, affection and captivation. In this assessment, we are trying to bring into limelight such kind of work originated by the literati that is also recognized as journalists, poets or authors, moreover, they have been associated with newspapers and magazines as columnists. Like Ibn e Insha, Mustansar Hussain Tarar, Raza Ali Abidi, and Mahmood sham.

The purpose is to investigate how people from diversified backgrounds view the world, its landscapes and its dwellers. The features separate thoughts and terrains of visualization, vision, imaginations and metaphors of a writer, poet and journalist from a common man. And how his pen sketches these sceneries for his admirers and book lovers. It is necessary to learn whether there exists any real difference between the visions and observations of a poet, author and a journalist. Is there exists any notable difference in their styles

Key words: Travelogue, Ibn e Insha, Mustansir Hussain Tarar, Raza Ali Abidi and Mahmood Sham

سفرنامہ ایک ایسی بیانیہ صنف ہے جس میں مسافر کسی خاص مقام کا سفر کر کے اپنے خیالات اور تجربات کو اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والا بھی گھر بیٹھے اس مقام کی سیر کر لیتا ہے۔ یہ واحد صنف ہے جس میں بہت سی دوسری اصناف مثلاً تاریخ جغرافیہ، مزاح، رپوتاژ، داستان، افسانہ، ناول، سوانح وغیرہ کی خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ اسی لیے اس کو ”ام الاصناف“ بھی کہا جاتا ہے۔[۱]

سفرنامہ نہ صرف مخصوص زمانے کی تاریخ، علاقے کے تہذیبی و معاشرتی حالات کا عکاس ہوتا ہے بلکہ اس میں اس میں کہانیوں جیسی روانی بھی ایک خاص خوبی تصور کی جاتی ہے۔ مسافر کا مشاہدہ براہ راست قاری کو متاثر کرتا ہے۔ خصوصاً مسافر اگر صحافی ہو تو اس کا مشاہدہ خالص اور کھرا ہونا لازمی جزو ہوگا۔ مشاہدے کے ساتھ مسافر کو منظر کشی کرنے کا فن بھی آنا چاہیے۔

جس طرح کامیاب خاکہ وہی ہے جس میں شخصیت کی چلتی پھرتی تصویر سامنے آجائے اسی طرح سفرنامے میں منظرکشی ایسی ہونی چاہیئے کہ مسافر کے ساتھ قاری بھی اس مخصوص علاقے کی سیر کرلے۔ اس سارے مراحل میں ''تحیر'' کو ساتھ لے کر چلنا ضروری ہے۔ یہ تحیر ہی ہے جو انسان کو نت نئے راستوں کی کھوج پر اکساتا ہے اور پڑھنے والوں کو مسافر کا ہاتھ تھامے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

سفرنامے کے لئے کوئی اسلوب مقرر نہیں کیا گیا، سفرنامہ نگار اپنے مزاج، تجربات اور تخلیقی صلاحیت کے مطابق سفرنامے کا اسلوب متعین کرتا ہے، گویا سفرنامہ نگار آزاد ہے، جس طرح چاہے اسے تحریر کرے۔لیکن لازماً خیال رکھے کہ سفرنامہ، سفرنامہ رہے،آپ بیتی، داستان، ناول یا افسانہ نہ بن جائے، سفرنامے میں یقیناً پُر اسراریت اور دلچسپی کا سامان ہوتا ہے،لیکن غیر ضروری رنگین بیانی سفرنامہ کو مجروح کردیتی ہے۔

ہم نے یہاں چند ایسے سفرناموں پر قلم اٹھایا ہے جن کے قلم کاروں کی ایک پہچان ''صحافت'' بھی ہے۔ ان اصحاب کا بنیادی تعلق صحافت اور ادب سے ہے، یا بطور کالم نگار اخبارات اور میگزین سے بھی وابستہ رہے۔مقصد یہ ہے کہ یہ جانا جائے کہ ایک صحافی دنیا کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ایک ادیب اور صحافی کی نظر ایک عام شخص سے کتنی مختلف اور عمیق ہوتی ہےاور ان کا قلم ان مناظر کو لوگوں تک کس انداز میں پہنچاتا ہے۔ بحیثیت صحافی ان کے محسوسات اور جذبات کیا ہیں۔اور ان جذبات کو انہوں نے کس پر اثر انداز میں قاری تک پہنچایا۔اور کیا ادیب اور صحافی کی نظر اور مشاہدے میں کوئی خاص فرق ہوتا ہے یا نہیں۔؟ان کے اسلوب میں کوئی خاص فرق نظر آتا ہے یا نہیں۔؟ اس حوالے سے ہمارے پیش نظر دنیائے ادب کے نامور لکھاری ابن انشا، مستنصر حسین تارڑ، رضا علی عابدی اور محمود شام صاحب کے سفرنامے ہیں۔

سب سے پہلے مختصر جائزہ لیتے ہیں ابن انشا کے سفرناموں کا۔انشا جی کو کون نہیں جانتا۔وہ ادیب بھی ہیں، شاعر بھی،اور کالم نگار بھی۔ان کی شاعری میں غضب کی موسیقیت ہے۔جو پڑھنے والوں میں آج بھی مقبول ہے۔ان کی شاعری کو گنگنا کر آج بھی گلوکار شہرت کمارہے ہیں۔بات ہو کالم نگاری اور سفرنامہ نگاری کی تو اس میں بھی انشا جی کا انداز سب سے جدا اور منفرد ہے۔ ان کا سب سے پہلا سفرنامہ چلتے ہو تو چین چلیئے، تھا اس کے بعد'' دنیا گول ہے''،''ابن بطوطہ کے تعاقب میں''،'' آوارہ گرد کی ڈائری'' اور سب سے آخری ''نگری نگری پھرا مسافر'' جو ان کی وفات کے بارہ برس بعد شائع ہوا۔

انشا کے سفرنامے ظرافت سے بھرپور ہیں۔ظرافت بھی ایسی کہ۔ہنس ہنس کے پیٹ میں بل پڑ جائیں اور قہقہوں کی برسات شروع ہوجائے۔طنزومزاح پر مبنی سفرناموں میں وہ اپنے رنگ اور فن میں یکتا ہیں۔ان کی تمام کتابوں میں طنزومزاح پر مبنی تحریر کے سنگ دلچسپ خاکے بھی ضرور ہوتے ہیں۔ سفرناموں میں ملکوں شہروں کی تاریخ، طویل خشک داستانوں کے بجائے روزمرہ کے معمولات، سیروسیاحت کے دوران لوگوں سے بات چیت کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ انہوں نے حاضر جوابی شگفتگی اور شوخی وشرارت سے کام لیا۔ پہلا سفرنامہ چین کے بارے میں تھا۔جس کے بارے میں ساٹھ کی دہائی

میں بہت کم مواد دستیاب تھا۔سرخ انقلاب والے چین میں قدم قدم پر ''تحیر'' تھا۔ وہ تحیر جو سفرنامے کا بنیادی جزو ہے۔کتاب کے فلیپ پر لکھی تحریر قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے''یہ داستان رنگین ہے۔چین کے الہ دینوں اور جنوں کی۔جو پل بھر میں محل اوراٹاریاں کھڑی کردیتے ہیں۔شہزادیوں کے لیے نہیں عوام کے لیے۔اور پھر بیاں اپنا۔۔۔''[۲] بے شک بیاں انشا جی کا ہو تو کون بدذوق پڑھنے پر مجبور نہیں ہوگا۔ان کے ہاں روانی اور فطری بے ساختگی ہے۔ انشا جی قلم برداشتہ لکھتے تھے۔چین کے دورے میں انہیں ''آزادی'' کی شدید کمی محسوس ہوئی لکھتے ہیں۔

> ہمارے ایک ساتھی جو اپنے ساتھ پان لے کر گئے تھے بار بار فرماتے تھے یہ کیسا ملک ہے سڑکوں پر تھوک نہیں سکتے۔زیادہ دن یہاں رہنا پڑا تو زندگی حرام ہوجائے۔ یہاں خریداری کا لطف نہیں دکاندار بھاؤ تاؤ نہیں کرتے۔بسوں اور کاروں کے اختیارات بھی بے حد محدود ہیں۔آپ اپنی بس کو فٹ پاتھ پر نہیں چڑھا سکتے۔نہ کسی مسافر کے اوپر سے گزار سکتے ہیں اور تو اور بجلی کے کھمبے سے ٹکرانے تک کی آزادی نہیں۔[۳]

انشاجی کے سفرنامے ادیبوں کے وفد کے ہمراہ یا سرکاری نوعیت کے ہیں۔ ہفتے میں تین سے چار کالم لکھنا ان کی ذمہ داری تھی۔اخباری ضرورتوں کے پیش نظر وہ سفر کے دوران سفری روداد لکھ کر بھیجتے تھے۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان سفرناموں میں ایک نقص کھلتا ہے کہ اس میں ترتیب کی کمی محسوس ہوتی ہے۔لیکن ان کے چٹخارے دار مزاح کے آگے یہ کمی کبھی نمایاں نہیں ہوئی۔زود گوئی کے باوجود ان کا معیار کبھی نہیں گرا۔

ابن انشا لفظوں کا جادوگر تھا اردو، پنجابی انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی اور فارسی پر بھی بھرپور گرفت تھی۔دنیا گول ہے میں سفر ایران کے دوران جس طرح فارسی بولنے کی کوشش میں مزاحیہ صورتحال پیش آتی ہے وہ بے ساختہ،شگفتہ اور جیتے جاگتے مزاح کی عمدہ مثال ہے۔ الفاظ کی اسی ہمہ گیریت نے ان کے اسلوب کو بھی چار چاند لگائے ہیں۔رواں،سادہ جملے اتنے چست ہیں کہ پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتے ہیں اور زبان زد عام ہوجاتے ہیں۔

قدم قدم پر طنز ومزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہوئے انشا جی کے سفرنامے پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ وہی ''چاندنگر'' کے انشا جی ہیں۔حساس،اداس اور تنہا۔ممتاز مفتی اپنے مشہور زمانہ خاکے میں جسے ''گونگا'' قرار دیتے ہیں کہیں ''خودکشی'' پر آمادہ قرار دیتے ہیں۔[۴] وہ جب شاعری کرتا ہے تو روگی ،جوگی اور سادھو نظر آتا ہے اور جب نثر لکھتا ہے تو ایسی با کمال کہ یوسفی جیسا بڑا مزاح نگار بھی رطب اللسان ہوجاتا ہے۔ جیسے مزاح کی پٹاری کھل جائے جس میں سے طنز لطیف سے بھرپور رنگ برنگے ظرافت نامے نکلتے چلے جائیں۔

ابن انشا کو مزاح نگاری طرف مائل کرنے میں قدرت اللہ شہاب کا ہاتھ تھا۔کسی موقعے پر انشا جی نے شہاب صاحب کو خطوط لکھے۔جس میں طنز ومزاح کی ایسی پھلجڑیاں ہوتیں کہ قدرت صاحب نے شاعر ابن انشا کو مزاح نگاری پر

مجبور کیا۔[۵] اور یہی مزاح انشا جی کو دوسرے سفرنامہ نگاروں سے ممتاز کرنے اور سفرناموں کو اچھوتا رنگ دینے میں معیار ٹھہرا۔ جس طرح یوسفی اور شفیق الرحمان کا مزاح اپنی پہچان الگ رکھتا ہے۔ ویسے ہی انشا جی بھی اپنے رنگ کے یکتا مزاح نگار ہیں۔ ان کے ہاں دیگر سفرنامہ نگاروں کے برعکس طنز لطیف کے نشتر اپنی ذات پر چلتے ہیں۔ یہ ابن انشا کا وہ خاص جوہر ہے جو کسی دوسرے کے ہاتھ نہ لگ سکا۔ جسے ہم 'ہجو ملیح' کی عمدہ مثال قرار دے سکتے ہیں۔ ابن بطوطہ کے تعاقب میں لکھتے ہیں۔

> ہم نے ان کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ کروڑوں آدمیوں کی اس زبان کے عظیم ادب میں ہمارا کیا مقام ہے۔ کیسے ہمیں وہاں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ کیسے ہمارے ملک کی گوریاں ہمارے آنے کی خبر سن کر قطار در قطار کھڑی ہوجاتی ہیں۔۔۔۔ ہم نے موصوفہ سے کہا تم اپنے حساب سے یوں سمجھ لو کہ جیسے جرمن ادب میں گوئٹے۔ کچھ ایسے ہی اردو ادب میں ہم ہیں۔ فیض کے دو تین اشعار کا ترجمہ بھی سنایا کہ یہ ہمارا نمونہ کلام ہے۔ بہت خوش ہوئیں۔[۶]

انشا جی کے سفرناموں پر مختصر نگاہ ڈالنے کے بعد ذکر کرتے ہیں مستنصر حسین تارڑ کا جو بلاشک وشبہ اس وقت اردو کے سب سے نامور سفرنامہ نگار ہیں۔ پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف کی تصانیف شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجاتی ہیں۔ ان کے فن کی کئی جہتیں ہیں۔ سفرنامہ نگار، ناول نگار، کالم نگار، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، اداکار اور ٹیلی ویژن کے معروف میزبان ''چاچا جی'' بھی۔

تارڑ نے سفرناموں کا آغاز مغرب سے کیا۔ ایک ماڈرن بنجارے کی طرح اپنا سفری بیگ کاندھے پر لٹکایا اور '' نکلے تیری تلاش میں''۔ یورپ کے مختلف شہروں پر مشتمل پہلے سفرنامے سے وہ شہرت ملی جس نے صرف تارڑ ہی نہیں بلکہ اردو سفرنامے کے قد کاٹھ میں بھی اضافہ کیا۔ ان کے سفرناموں میں کیا نہیں ہے؟ تاریخ گوئی سے ناول نگاری تک تمام ہی لوازمات پورے ہیں۔ حیرت و تجسس، رومانیت، چٹکلے، کردار نگاری، مشاہدے کا رومانوی انداز، ناول اور افسانے کی خوبیاں۔ اپاہج پاسکل ہو یا چترال داستان کی ہسپانوی کوہ نورد لڑکی۔ تارڑ کے سفرناموں کے کردار باریک بینی سے تراش کر بنائے گئے ہیں۔ جس میں ابتدا مکالمے، کلائمکس اور انتہا موجود ہے۔ پاسکل سے پہلی ملاقات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> کیا یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟ میں نے اپنا سفری بیگ کاندھے پر رکھا اور ایک ہاتھ میں پاسکل کا سوٹ کیس اٹھالیا۔ تم گاڑی میں جا کر بیٹھو میں آجاؤں گی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ محترمہ پہلے آپ، میں نے شِولری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھک کر کہا۔ پاسکل نے سرخ کوٹ اٹھایا اور بالکل ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سانس رک گیا ہو۔ میرے قدم

عرشے کی گیلی لکڑی پر میخوں سے ٹھونک دیے گئے ہوں۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ قدرت کا ایک بھونڈا مذاق تھا۔(۷)

تارڑ صاحب کی چٹخارے دار زبان، رنگینیٔ بیان، افسانونی انداز، بین السطور طنز، نفسیاتی رنگ، گہرے مطالعے اور مشاہدے نے ان کے سفرناموں میں وہ تاثر پیدا کیا ہے کہ آج وہ اردو کے مقبول عام سفرنامہ نگار ہیں۔ انہیں معلوم ہے قاری کیا پڑھنا چاہتا ہے۔ ان کا منفرد ڈرامائی اسلوب ہی دراصل انہیں دوسرے سفرنامہ نگاروں سے ممتاز بناتا ہے۔

تاریخ، تحقیق اور تنقید یہ تینوں موضوعات عموماً بڑے ہی خشک، کھردرے سے ہوتے ہیں۔ لیکن تارڑ صاحب صدیوں پرانی باتوں ایسے بیان کرتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ انہیں تاریخ سے دلچسپی ہے اور کہانی کہنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے۔ تارڑ اپنے سفرناموں میں حقائق کو دلچسپ اور تحیر انگیز انداز میں بیان کرتے ''اندلس میں اجنبی'' کا مسافر تاریخ کو رومانوی انداز میں بیان کرتا ہے۔ کونج سے بچھڑا ہوا پرندہ گویا اپنے گھر واپس آیا ہو لیکن وہاں اب اس کا اپنا کوئی نہیں۔ ''ہنزہ داستان'' میں شاہراہ ریشم کے بارے میں حقائق پڑھتے ہوئے قاری کئی جگہ حیرت سے منہ میں انگلی داب لیتا ہے۔ چترال داستان میں کیلاشیوں کو جنت کا ٹکٹ دلانے کی مہم میں ملا اور پادری دونوں ہی سرگرداں ہیں۔ تارڑ صاحب لکھتے ہیں:

اگر کوئی کالاش مسلمان ہوجائے تو اسے عہد کفر کے قرضہ جات سے بری الذمہ قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کالاش اپنی بیوی سے علیحدگی کا خواہشمند ہو اور رواج کے مطابق وہ بھیڑوں، گھی اور فصل کا تاوان ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو مسلمان ہوجانے سے کافر بیوی خودکار طریقے سے الگ ہوجاتی ہے۔ اور ہینگ اور بھٹکری وغیرہ بھی نہیں لگتی۔ اسی طور پادری حضرات ان بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو لالچ دیتے ہیں کہ اگر وہ راہ راست پر آجائیں تو شہر میں ان کو ملازمتیں دی جائیں گی اور ان کے بچے مشنری اسکولوں میں مفت پڑھیں گے۔ چنانچہ مولوی اور پادری صاحبان کفار کو اس قسم کی بے شمار ''سہولتیں'' دینے کا وعدہ کر کے ان کی آخرت سنوارتے ہیں۔(۸)

تارڑ صاحب کو قدم قدم پر ایسی خواتین اور طرح طرح دار لڑکیاں ٹکراتی ہیں کہ قاری تو ایک طرف ان کے ہم پلہ سفرنامہ نگار بھی رشک و حسد میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ تارڑ کے سفرنامے پڑھتے ہوئے یہ سوال بارہا ذہن میں آتا ہے کہ مغرب کی خواتین کی بے باکی اپنے شناساؤں کے ساتھ محدود ہوتی ہے یا راہ چلتوں کے ساتھ بھی وہ اتنی ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ کیا واقعی یہ حقیقت پر مبنی باتیں ہیں۔ کہیں یہ فرضی داستان تو نہیں؟

تارڑ صاحب نے گلگت بلتستان پر تقریباً بارہ سفرنامے لکھے۔ جہاں ہر سو پہاڑی بلندیاں ہوں، گلیشئرز، برفانی جھیلوں اور پہاڑوں کے بیس کیمپ ہوں وہاں بھی تارڑ نے لفظوں کی ایسی جادوئی بنت کی کہ ایک ایک منظر کسی حسین خواب کی

صورت واضح ہوگیا۔ان کے سفرناموں کی اہم خوبی منظر نگاری بھی ہے ۔اپنے ملک کی خوبصورتی کو جس طرح تارڑ صاحب نے بیان کیا ہے اس آنکھ سے پہلے کسی نے دیکھا نہ ہی بیان ہوا۔ اس حوالے سے ان پر تنقید بھی ہوتی ہے کہ منظر نگاری میں تخیل سے کچھ زیادہ ہی کام لیتے ہیں۔لیکن یہی منظر نگاری انہیں عوام میں مقبول عام بنانے میں اہم کردار بھی ادا کرتی ہے یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ ملک کے بالائی علاقوں کی سیاحت کو بڑھانے میں تارڑ کا بھی ہاتھ ہے۔

تارڑ صاحب کے سفرناموں کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ ان کا ''لاہوریا'' انداز بھی ہے۔سفرنامہ پیرس کا ہو یا ہنزہ کا،کالاش کا ذکر ہو یا ترکی و ایران، انہیں ہر جگہ لاہور کی بات اور یاد ستاتی ہے۔ ان کی تحریر میں بھی وہی بے تکلفی جھلکتی ہے۔ پنجاب کی سوغاتیں ہوں یا پنجابی زبان کی اصطلاحیں وہ ان کی روح میں بستی ہیں ۔جس کا برمحل استعمال وہ خوب جانتے ہیں ۔ایک نجی ادبی محفل میں انہوں نے اعتراف کیا تھا کہ اردو زبان کا استعمال تصانیف کی فروخت کے لیے کرتے ہیں ۔ اگر ان کا بس چلے تو وہ سفرناموں سمیت تمام تصانیف پنجابی زبان میں لکھیں ۔ کیونکہ پنجابی ان کی روح کی زبان ہے۔

اردو کے صحافی سفرنامہ نگاروں میں ایک اہم نام رضا علی عابدی کا بھی ہے۔ان کی سب سے بڑی پہچان بی بی سی اردو سروس ہے اور رضا علی کے پیش کردہ ریڈیائی سفرنامے'' کتب خانہ، جرنیلی سڑک،شیر دریا اور ریل کہانی اردو سروس کی پہچان بنے۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ ریڈیو پروگرام کو تو قبول عام ملا ہی جس سے رضا صاحب برصغیر کے ہر گھر میں ایک جانا پہچانا نام بن گئے لیکن بڑا کام یہ ہوا کہ یہ کارنامہ ہواؤں کے دوش پر کہیں کھونے کے بجائے کتابی شکل میں بھی محفوظ ہوگیا۔ ریڈیو پر پیش کیے گئے ان کے تمام سفرنامے برصغیر کے حوالے سے تھے جبکہ ''جہازی بھائی'' وہ واحد سفرنامہ ہے جس کا براہ راست برصغیر سے تعلق نہیں نا ہی وہ ریڈیو پر نشر کیا گیا۔ان کا پہلا سفرنامہ ''کتب خانہ'' تھا۔

رضا صاحب کی زبان و بیان ،ان کا اسلوب اس قدر شاندار ہے کہ پڑھنے والا پڑھتا ہی چلا جائے اور بوریت کا شکار نہیں ہوتا ۔ان کے الفاظ میں وہ چاشنی ہے کہ برسوں جملے ذہن پر نقش رہتے ہیں۔ رضا صاحب کا سب سے بڑا ہتھیار ان کی آسان گوئی ہے۔کتب خانہ کا پیش لفظ مشہور مستشرق رالف رسل نے لکھا ہے۔جو عابدی صاحب کی سادگی وسلاست کے مداح نظر آتے ہیں۔

> رضا علی عابدی کی زبان وطرز بیان دونوں اتنے اچھے ہیں کہ پڑھ کے طبیعت خوش ہوگئی ۔ نہ انگریزی الفاظ کا بلاضرورت استعمال اور نہ ثقیل اردو الفاظ سے مرعوب کرنے کی کوشش۔سلیس اور رواں اردو میں اپنی بات کہے جاتے ہیں ۔اور پڑھنے والے کو بڑا لطف آتا ہے۔(۹)

رضا علی کے سفرنامے ایک عہد کے ترجمان ہیں۔''جرنیلی سڑک'' اسی کی دہائی کے اواخر میں پیش کی گئی۔ جب پاکستان میں افغان پناہ گزینوں کا سیلاب رواں تھا۔ امریکی سی آئی اے نے پاکستان اور افغان طالبان کو ایک مہرہ کی طرح

استعمال کیا، سکوں کی چمک اور طاقت کے نشے میں حکمرانوں نے وہ فیصلے کیے جو آج بھی پاکستان کے لیے سمِ قاتل ثابت ہو رہے ہیں۔ دوسری جانب پاکستان سے ہندوستان کا سفر۔ دونوں ممالک کی تہذیبوں میں خوشحالی اور بدحالی کا سفر بھی ہے۔ جرنیلی سڑک پڑھ کے اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ صرف تین دہائی قبل تک پاکستانیوں کی معاشی حیثیت ہندوستانیوں کے مقابلے میں کہیں بہتر تھی۔

رضا صاحب کی تحریروں سے یہ بات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ وہ شجر سایہ دار ہیں جن کے نیچے بیٹھ کر آپ تہذیب و تمدن اور اقدار کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ بدلتے زمانوں میں کیا معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جدیدیت کی دھن میں کہاں کیا کھویا اور کیا پایا سب ان کے سفرناموں کا حصہ ہیں۔ اردو ادب کا ایک بڑا نام انتظار حسین کا ہے۔ لندن کے ایک سفر میں جرنیلی سڑک ان کے ہاتھ میں آئی تو اس کے سحر میں انہیں ارد گرد کے خوبصورت مناظر بھی نظر نہ آئے۔ انتظار صاحب نے انہیں ''ماڈرن سند باد'' کا نام دیا۔[۱۰] وہ لکھتے ہیں:

> Raza Ali Abidi deserves all the praise showered on him as a travelogue writer. I still remember my first experience with his travelogue Jarneli Sarak... I was eagerto have a view of the British landscape from london to manchaster, but the book played trick on me. I soon found myself roaming in the Sub continent from city to city. Manchester was no more my destination. I was now eager to reach Sahsram and pay my homage to Sher Shah Suri.[11]

سفرنامے میں مشاہدے کی قوت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ایک اچھا کامیاب سفرنامہ وہی ہوتا ہے جس میں سفرنامہ نگار اپنے مشاہدے کو دلچسپ اور بہترین ادبی بنت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ ''شیر دریا'' میں رضا صاحب نے نہ صرف اپنا مشاہدہ پیش کیا بلکہ اپنے روایتی سادہ انداز میں قدیم و جدید کی ڈور میں الجھے لوگوں کے ذہن کی خوب عکاسی کی ہے۔ شیر دریا ہو یا جرنیلی سڑک تمام سفرناموں میں ان کا سیاسی شعور بھی نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

ابتدائی طور پر ریڈیو سامعین کے لیے تخلیق کیے گئے سفرناموں میں اختصار کو ملحوظ رکھنا پڑا۔ اس اختصار نے گفتگو میں وہ نکھار پیدا کر دیا ہے جو ادیب کی پہچان بن گیا۔ اس اختصار کا بھی اپنا حسن ہے۔ کوزے کو دریا میں ڈالنا کیا مشکل؟ لیکن دریا کو کوزے میں سمیٹنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

منظر نگاری رضا صاحب کی تحریر کی وہ بنیادی خوبی ہے۔ جس کا سحر آج بھی پوری طرح قائم ہے۔ چاہے وہ سفرنامہ لکھ رہے ہوں یا افسانہ، منظر نگاری اتنی عمدہ کرتے ہیں کہ پڑھنے والے خود اسی منظر میں پہنچ جاتے ہیں۔ جب وہ امرتسر پہنچے تو لوگوں نے انہیں بہت خوش دلی سے خوش آمدید کہا، وہیں مسجد میں بیٹھے بزرگوں نے علاقے کی سب سے قدیم مسجد خلیفہ

عبدالعزیز کا ذکر کیا تو رضا صاحب کچی پکی گلیوں میں مسجد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔[۱۲]

رضا صاحب کہنے کو دنیا کے سب سے بڑے صحافتی ادارے سے وابستہ تھے۔جس زمانے میں یہ سفر کیے گئے برصغیر میں بچہ بچہ اردو سروس سے واقف تھا۔براڈ کاسٹرز کی شہرت بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ظاہر ہے ادارہ اپنے مشہور براڈ کاسٹر کو بہترین سفری سہولیات اور آرام دہ ہوٹلز میں ٹھہرا سکتا تھا ان کے کھانے پینے کا وی آئی پی انتظام ہوسکتا تھا لیکن رضا صاحب ان سیاحوں میں سے نہیں جو زمینی مشکلات اور حقائق جانے بغیر محض اعلیٰ ہوٹلز میں رہائش اور اے ون سفری سہولیات میں وقت گزرنے کو سفرنامہ قرار دے دیتے ہیں بلکہ وہ لوگوں کے ساتھ چلتے ہیں۔وہ آپ کو سڑکوں پر،ڈھابوں پر،سستے ہوٹلوں اور بس یا ریل میں عام لوگوں کے ساتھ سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے سفری ساتھی پاکستانی بھی ہیں اور ہندوستانی بھی، بوڑھے بھی ہیں جوان بھی، بچے بھی اور کہیں کہیں خواتین بھی، مذہبی بھی ہیں، لبرل بھی اور دلچسپ بھی، حقیر وفقیر بھی ہیں اور عالی مرتبت بھی لیکن ان سب میں ایک بات جسے رضا صاحب نے اہمیت دی ہے وہ یہ کہ گفتگو میں ان لوگوں کی رائے کو اہمیت دی ہے جو کسی بھی مذہب یا قوم سے پہلے انسان ہیں جو آپس میں نفرت نہیں کرتے۔عابدی صاحب کیونکہ خود متحدہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔جہاں ان کی دوستیاں مذہب سے بالاتر تھیں۔ان کے سفر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوئے۔اس لیے ان کی باتوں میں ہمیں وہ رواداری ملتی ہے جو کسی بھی انسان دوست معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔

اب ہم محمود شام صاحب کا ذکر کرتے ہیں۔جو ایک نامور صحافی ہیں۔جن کا صحافتی اور ادبی تجربہ ساٹھ برس سے زائد کا ہے۔شاعری کی ابتدا ۱۹۵۹ء میں ہوئی اور صحافت کا آغاز ۱۹۶۲ء میں کیا۔تیس سے زائد کتابوں کے مصنف شام صاحب کا نظم ونثر سے گہرا تعلق ہے۔ان کی تصانیف میں سفرنامے، ناول، شاعری، رہنماؤں کی تقریریں اور کالموں پر مبنی کتابیں شامل ہیں۔ان کے بیشتر سفر صحافتی مقاصد کی وجہ سے تھے۔ذوالفقار علی بھٹو، محترمہ بینظیر بھٹو اور جنرل مشرف، یاسر عرفات، اندرا گاندھی، گیرالڈ فورڈ، شیخ مجیب الرحمان سمیت کئی قومی و بین الاقوامی رہنماؤں اور سربراہان مملکت کے ساتھ بین الاقوامی دوروں اور مصاحبوں میں شامل رہے۔۱۹۷۷ء میں جنرل ضیا کے مارشل لا دور میں انہیں آفیشل سیکریٹ ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے سینٹرل جیل کراچی میں قید کیا گیا۔اسی دور میں ان کی بیشتر کتابیں ضبط کر لی گئیں۔[۱۳] سفر پر مبنی ان کی کتابوں میں لاڑکانہ سے پیکنگ، بھارت میں بلیک لسٹ، امریکا کیا سوچ رہا ہے، برطانیہ میں خزاں اور رحمان کے مہمان شامل ہیں۔یہ دورے سرکاری نوعیت کے تھے جس میں انہیں صحافتی ذمہ داریاں نبھانی تھیں لیکن ''رحمان کے مہمان'' وہ واحد سفرنامہ ہے جو حجاز مقدس اور سفر حج کے حوالے سے آپ نے اپنے ذاتی احساسات وجذبات کے ساتھ لکھا۔

کسی بھی شخص کی تحریر، خصوصا سفرنامہ اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔یعنی جیسی شخصیت ویسا سفرنامہ۔ملک کے معتبر ترین صحافیوں میں سے ایک محمود شام جن کا ملکی سربراہان سے براہ راست تعلق رہا اس کے باوجود وہ کسی بھی کروفر سے پاک انتہائی سادہ بلکہ منکسر المزاج شخصیت کے مالک ہیں۔یہی سادگی ان کے سفرناموں میں بھی نظر آتی ہے۔شام صاحب

کے سفرناموں میں معاشرے کے استحصالی طبقے کے خلاف جذبات کی شدت نظر آتی ہے۔امن وآشتی اور انسان دوستی ان کا نصب العین ہے۔وہ اپنے قاری کو بھی اس کی ترغیب دیتے ہیں۔

سفر کے حوالے سے ان کی پہلی کتاب ''لاڑکانہ سے پیکنگ تک''(چند سفر مسٹر بھٹو کے ساتھ) ہے۔اردو اورانگریزی زبانوں میں پیش کی گئی یہ کتاب ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک مختلف سفر اور سیاسی تقاریب کی روداد پر مشتمل ہے۔جس میں سے بیشتر مغربی پاکستان میں کیے گئے جبکہ آخری حصہ چین کے دورے پر مشتمل ہے۔متحدہ پاکستان کا یہ دور ملکی تاریخ کا المناک دور ہے۔جب ایک بڑا باشعور طبقہ جمہوریت کی بقا کے لیے کوشاں اور سیاسی جدوجہد کررہا تھا۔جاگیرداری طبقے کے خلاف ایک اشتعال تھا۔یہی دور تھا جب ملک کا ایک حصہ ہم سے جدا ہوا۔تاریخ کا یہ لمحہ اس کتاب میں محفوظ ہوگیا۔شام صاحب لکھتے ہیں۔

> یہ روداد ہر سفر کے فوراً بعد لکھی گئی ہے، اس میں کسی پر تنقید ہے نہ کسی فعل پر تبصرہ۔ واقعات جس طرح رونما ہوئے اور حالات جس طرح کہ میں نے انہیں دیکھا اور خیالات جس طرح کہ میں نے انہیں محسوس کیا۔ان کی دستاویز ہے۔(۱۴)

محمود شام بھٹو صاحب کے دلفریب نعروں سے متاثر نظر آتے ہیں۔روٹی، کپڑا اور مکان وہ نعرہ تھا جو کچلے ہوئے طبقے میں بھٹو کی پہچان بنا۔استحصالی طبقے کے خلاف جدوجہد ہر باشعور شخص کا خواب ہے جو مملکت میں شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا۔یہ کتاب سفر پر مبنی تو ہے لیکن سفرنامے سے زیادہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت سے اسے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔شام صاحب کے ہاں ایک شائستگی ہے۔وہ تنقید برائے تنقید کے قائل نہیں۔کیونکہ منفی گفتگو ان کی سرشت میں غالباً شامل ہی نہیں۔وہ شفیق بزرگ کی حیثیت سے شائستہ انداز میں غلطی کی نشاندہی ضرور کردیتے ہیں۔

ادبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ''رحمان کے مہمان'' ان کا سب سے بہترین سفرنامہ ہے ۲۰۱۷ء میں کیے گئے سفر حج کی روداد ہے۔جس میں ان کے جذبات و احساسات عروج پر ہیں۔احرام باندھتے ہی قلب و ذہن میں وہی تبدیلی محسوس ہوئی۔عجز وتسلیم کا وہی عالم تھا۔جب رب کے حضور حاضری کا ایک ایسا لمحہ، جب بادشاہ ہو یا گدا سب اپنے رب کے حضور سر جھکائے کھڑے ہوتے ہیں۔زندگی بھر کی کوتاہیاں نگاہوں کے سامنے ہوئے ہیں۔لبوں پر معافی اور آنکھوں میں ندامت کے آنسو لیے عاصی شخص رب کی بارگاہ میں پیش ہوتا ہے۔محمود شام بھی معافی کے طلبگار، نظر جھکائے کھڑے ہیں۔۸۷ برس کی عمر میں کیے گئے اس اٹھارہ دنوں کے اس سفر کو 'حاجی محمود' اپنی زندگی کا حاصل قرار دیتا ہے۔احرام باندھتے ہی ان کے قلب و ذہن میں وہی تبدیلیاں رونما ہوئیں جو ہر مسلمان کو اپنے ''روحانی وطن'' میں خدا کے گھر پہنچ کر ہوتی ہیں۔عجز وتسلیم کا وہی عالم، خدائے بزرگ و برتر پر کامل یقین کہ جس آستانے کے سامنے کھڑے ہیں وہ مایوس کیسے کرسکتا ہے۔

یہ سفرنامہ صرف ان کے ذاتی جذبات و احساسات اور روحانی تجربات پر مبنی نہیں بلکہ جدید وقدیم کا امتزاج ہے۔

اس میں معلومات کے خزانے بھی ہیں اور سلیس زبان میں مشاہدہ اور جذبات و احساسات بھی۔ وہ گاہے بگاہے قاری کی انگلی تھامے تاریخ کی گہرائیوں میں ڈوبے نظر آتے ہیں کہ کیسے عشاق پیدل اور اونٹوں پر مہینوں اور برسوں سفر کر کے ارض مبارک پہنچتے تھے۔ دیگر اہم تصاویر اور دستاویزات کے علاوہ نواب مصطفی علی شیفتہ کے حج کا تاریخی سفرنامہ جس میں انہیں دو سال چار ماہ لگے، بھی کتاب کی زینت ہے۔

ان کی ایک اہم تصنیف بھارت میں بلیک لسٹ بھی ہے جو ۱۹۷۲ء سے ۲۰۰۱ء کے دوران بھارت کے مختلف دوروں کے مشاہدات پر مشتمل ہے۔ یہ تمام دورے سرکاری نوعیت کے تھے اس لیے ان کا محور و مرکز صحافتی مقاصد تھے لیکن اس میں اس شخص کے جذبات و احساسات بھی شامل ہے کبھی جس کا تعلق اسی مٹی سے تھا۔ مختلف دہائیوں میں کیے گئے یہ سفر پاک بھارت تعلقات کے اتار چڑھاؤ کی کہانی ہیں۔

ایک ایسا ملک جہاں سے پرکھوں کی یادیں وابستہ ہوں لیکن سرکار ایک دوسرے کو دوسرے کو دشمن کی نگاہ سے دیکھے۔ ان ملکوں کے لوگ جب آپس میں پر جوش محبت بھرے انداز میں ملتے ہیں تو دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ اشوکا ہوٹل میں جب ایک ایسا ہی شخص جو تقسیم سے قبل لائل پور میں پیدا ہوا تھا، ہوٹل کی لابی میں شام صاحب سے پر تپاک انداز میں ملا تو دیگر ملکوں کے صحافی حیران رہ گئے۔(۱۵)

ایک سفرنامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر مشاہدہ کی زبردست قوت پائی جاتی ہو۔ اس کا غیر جانبدار، اور مستند ہونا بھی شرط اول ہے۔ محمود شام ایک مسافر کے ساتھ ساتھ صحافی بھی ہیں اسی لیے ان کے اندر یہ صلاحیت کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ ان کا مشاہدہ اتنا کھرا اور مستند ہے جسے جھٹلانا آسان نہیں ہے۔ راجپورہ جہاں کبھی ان کا آبائی گھر تھا۔ ان کے دادے پر دادے سب وہیں رہتے تھے۔ تقسیم کے وقت سارے بھائی اور ان کی اولادیں ماری گئیں شام صاحب کے والد اپنے اہل خانہ کے ساتھ انبالہ میں تھے جو محفوظ رہے۔ شام صاحب ہندوستان کے دورے پر پہنچے تو اپنے پرکھوں کی وراثت، اپنا گھر دیکھنے بھی پہنچے۔ ان کی آمد پر محلے داروں کا مجمع لگ گیا۔ جو ان کے خاندان سے واقف تھے۔ یادوں کی پٹاری کھلی تو بات دور تلک گئی۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''میرے تایا، چچا، تایا زاد بہن بھائی سب یہیں رہتے تھے۔ یہیں ان کا خون بہایا گیا۔ شاید ان مین سے بھی کسی نے ان کے خون سے ہاتھ رنگے ہوں۔ میں اپنے ہی قاتلوں کے درمیان ہوں۔''(۱۶) شام صاحب کے یہ الفاظ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ قاری اس منظر میں پہنچ جاتا ہے جہاں اسے ایک دل دہلا دینے والی حقیقت کا سامنا ہے۔

صحافی کو ادب سے اور ادیب کو صحافت سے ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔ دونوں کا علم ایک دوسرے کے بغیر ادھورا ہے۔ ہمارے منتخب صحافی سفرنامہ نگار تو جانے مانے ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ ادب سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ ان چاروں منتخب صحافی سفرنامہ نگاروں کے سفرناموں کا مختصر جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک صحافی کے قلم سے سفرنامے کا فن

ایک مختلف زاویہ نگاہ رکھتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو رضا علی عابدی اور محمود شام جن کا اوڑھنا بچھونا صحافت رہی۔ ان دونوں ادیبوں کے سفرناموں میں مسافر کی نگاہ ایک خالص صحافی کی ہے۔ جو معاملات کی تہہ تک پہنچنا جانتا ہے۔ جس کا سیاسی شعور بھی بلند ہے۔ بقول منیر احمد شیخ، وہ تجربے کی ''خبر'' یوں دیتے ہیں کہ سننے والا خود اس تجربے کا حصہ بن جاتا ہے۔[۱۷]
اسلوب کی بات کی جائے تو دونوں صحافی سفرنامہ نگاروں کے اسلوب انتہائی سادہ اور رواں ہے۔ ان کی تحریر میں کوئی ایسا لفظ ملنا مشکل ہے جس کے لیے لغت کا سہارا لینا پڑے۔ دونوں صحافی سفرنامہ نگاروں کے اندر ایک ''تجربہ کار بزرگ'' کی روح ہے۔ ایک ایسا بزرگ جو تنقید برائے تنقید کا قائل نہیں۔ چھڑی لے کر شاگردوں کو قائل کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ شستہ و شائستہ انداز میں اصلاح کے قائل ہیں۔ وہ اپنا مافی الضمیر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ تمام سفرناموں میں اپنے تجربات کے نتائج کو پرامید انداز میں قاری تک پہنچاتے ہیں۔ ہجرت کے زخم سہنے والے دونوں سفرنامہ نگاروں کے اسلوب میں بہت سی مماثلتیں ہیں۔ لیکن کہیں کہیں اختلاف بھی محمود شام کے سفرناموں میں ہمیں ایک نقص چھبتا ہے وہ یہ کہ اس میں منظر نگاری کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

جبکہ ابن انشا نہ صرف ان چاروں منتخب صحافی سفرنامہ نگاروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اردو ادب میں ان جیسا کوئی دوسرا پرمزاح سفرنامہ نگار ملنا مشکل ہے۔ مزاح پر مبنی سفرناموں میں ان کے رنگ کا کوئی دوسرا ہم سر نہیں۔ وہ اپنے فن میں یکتا اور تنہا ہیں۔ ابن انشا کے اندر حیرت انگیز خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کی ہنستی، مسکراتی، کھلکھلاتی، اور چٹکیاں کاٹتی نثر میں سنجیدگی کا ذرا بھی گزر نہیں۔ اور وہی انشا جی جب شاعری کرتے ہیں تو اس میں مزاح کی پرچھائیں بھی نہیں۔ گہری سنجیدگی، داخلیت کا اثر، محبت جس پر غم کے گہرے سائے چھائے ہیں۔ تنہا، اداس، انشا جی اپنی شاعری میں ایک روگی اور جوگی نظر آتے ہیں۔ خداداد صلاحیتوں کے مالک ابن انشا کی مختلف زبانوں پر مہارت نے انہیں کمال فن پر پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کا مشاہدہ اتنا عمدہ تھا کہ عام سی چیز کو خاص بنا دیتے۔ دوران سفر ملنے والے طرح طرح کے لوگوں سے گفتگو میں ہی ایسا لطف ہوتا ہے کہ قاری ہنس ہنس کے دوہرا ہو جائے۔ انشا جی کا ''طنز لطیف'' اپنی ذات کے لیے مخصوص ہے۔ وہ اپنی ذات کو نشانے پر رکھ کر بات میں لطف پیدا کرتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ موجودہ عہد میں اردو ادب کے سب سے مقبول سفرنامہ نگار ہیں۔ ان کے ہاں تخلیق کی آنچ سے سفرنامہ اس فن کا درجہ حاصل کر چکا ہے جہاں پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ان کے سفرناموں میں جہاں منظر نگاری، تاریخ سے دلچسپی، ماضی و حال کو ساتھ لے کر چلنا، رواں اسلوب، رنگینئ بیان، افسانوی انداز، مشاہدہ، نفسیاتی رنگ اور دیگر بہت سی خوبیاں نمایاں ہیں وہیں تنقید کے پہلو بھی ہیں۔ جیسے خواتین کے کردار کو بار بار سامنے لانا۔ خواتین کی بے تکلفی اور رنگینئ بیان کے لیے اس کی تفصیلات میں جانا۔ یا منظر نگاری میں حد سے زیادہ تخیل سے کام لینا۔ ان تمام تنقیدی پہلوؤں میں صداقت کے باوجود اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ سفرنامے میں فکشن کو شامل کر کے انہوں نے سفرنامے کے فن کو ایک نئی طرح

بخشی ہے۔مغرب سے سفرناموں کا آغاز کرنے والے تارڑ صاحب نے پاکستان کے پہاڑی علاقوں سے لے کر دریاؤں تک ،کے ٹو کی برف پوش چوٹیوں سے دریائے سندھ تک ملک کے چپے چپے کا حسن کچھ انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری سیاحت پر مجبور ہوجاتا ہے۔ملک میں سیاحت کو فروغ دینے میں تارڑ صاحب کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

ان چاروں منتخب سفرنامہ نگاروں کے حوالے سے یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ ''ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم۔

حواشی:

(۱) سعید احمد، آزادی کے بعد اردو سفرنامہ، (دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۹

(۲) ابن انشا، چلتے ہو تو چین کو چلیے (لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۸۱ء)، ص فلیپ

(۳) ایضاً، ص ۶۳

(۴) ممتاز مفتی، اور اوکھے لوگ (لاہور: فیروزسنز پرائیوٹ لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۳۹، دوسرا ایڈیشن

(۵) ایضاً، ص ۱۴۰

(۶) ابن انشا، ابن بطوطہ کے تعاقب میں (نئی دہلی: اردو بکس، دیرا گنج، س ن)، ص ۲۲۔۲۱

(۷) مستنصر حسین تارڑ، نکلے تری تلاش میں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء)، ص ۴۳۷

(۸) ایضاً، چترال داستان، ایضاً، ص ۱۶۶۔۱۶۵

(۹) رضا علی عابدی، پہلا سفر اور ہمارے کتب خانے (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۰۶

(۱۰) انتظار حسین (کالم)، A modern Sindbad مشمولہ روزنامہ ڈان، ۲۹/ اپریل ۱۹۹۴ء، ص ۴

(۱۱) ایضاً

(۱۲) رضا علی عابدی، ریل کہانی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۳۴

(۱۳) مصنفہ کی محمود شام سے گفتگو بذریعہ واٹس ایپ ۱۸ مارچ، ۲۰۱۸ء، وقت ۲۰:۳۰

(۱۴) محمود شام، لاڑکانہ سے پیکنگ تک، (کراچی: نیشنل فورم، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۰

(۱۵) ایضاً، بھارت میں بلیک لسٹ، (کراچی: ویلکم بک پورٹ، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۴۵

(۱۶) ایضاً، ص ۱۳۵

(۱۷) حسن رضوی، ''دیکھا ہندوستان'' لاہور: مکتبۂ عالیہ)، ۱۹۸۷ء، ص۔فلیپ

ماٰخذ:

(۱) ابن انشا، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، نئی دہلی: اردو بکس، دیرا گنج، س ن

(۲) ______، چلتے ہو تو چین کو چلیے، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۸۱ء

(۳) تارڑ، مستنصر حسین، نکلے تری تلاش میں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص ۴۳۷
(۴) ______، چترال داستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۶۶۔۱۶۵
(۵) سعید احمد، آزادی کے بعد اردو سفر نامہ، دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء
(۶) عابدی، رضا علی، پہلا سفر اور ہمارے کتب خانے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء
(۷) ______، ریل کہانی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء
(۸) مفتی، ممتاز، اور اوکھے لوگ، لاہور: فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء
(۹) محمود شام، بھارت میں بلیک لسٹ، کراچی: ویلکم بک پورٹ، ۲۰۰۲ء
(۱۰) ______، لاڑکانہ سے پیکنگ تک، کراچی: نیشنل فورم، ۱۹۷۶ء

اخبارات و رسائل

(۱) روزنامہ ڈان، ۲۹/اپریل ۱۹۹۴ء
انتظار حسین کا کالم "(1)abdi A modern Sindbad